من کی دنیا

مائل خیرآبادی

خنّاس

میرے ابا جان نے حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ سنایا کہ جب اللہ میاں نے حضرت آدم علیہ السلام کو بنایا تو فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کریں۔ فرشتوں نے سجدہ کیا۔ وہاں ایک جنّ بھی تھا۔ اُس نے سجدہ نہیں کیا تو اللہ میاں نے اس جنّ کو پھٹکار دیا اور اپنی رحمت سے دور کر دیا۔ اس جن کا نام ابلیس تھا۔

بس، اُسی دن سے ابلیس انسان کا دشمن ہو گیا۔ ابلیس کی ڈھٹائی تو دیکھئے۔ اللہ میاں کے سامنے بولا کہ میں اس انسان کو آگے سے، پیچھے سے، دائیں سے، بائیں سے اور ایسے ایسے طریقوں سے بہکاؤں گا کہ انسان سمجھے بھی نہ۔ اُس سے بُرے کام کروالوں گا۔

ابا جان نے یہ قصہ سنایا تو مجھے شوق پیدا ہوا کہ شیطان کو دیکھوں۔ میں نے ابا جان سے پوچھا۔ ''یہ ابلیس کہاں ہے اور کیسا ہوتا ہے؟'' ابا جان نے بتایا کہ وہ ہر وقت انسان کے پیچھے لگا رہتا ہے اور ایسا مکّار ہے کہ نظر نہیں آتا۔''

میں نے ابا جان کی یہ بات دہرائی کہ ''ابلیس ہر وقت انسان کے پیچھے لگا رہتا ہے۔'' پھر کیوں نہیں دکھائی دیتا؟ میرے دل میں پھر یہ سوال پیدا ہوا، میں نے اپنے مولوی صاحب سے کہا کہ شیطان کو دیکھنا چاہتا ہوں۔ مولوی صاحب نے جواب دیا کہ شیطان کو کوئی نہیں دیکھ سکتا۔ وہ تو جنّ ہے اور جنوں کو اللہ میاں نے انسان کی نظر سے اوجھل رکھا ہے۔''

مولوی صاحب کی یہ بات سن کر بھی دل نہ مانا۔ بلکہ شیطان کو دیکھنے کا شوق اور بھی بڑھ گیا۔ سوچا کیا کروں؟ ابا جان نے نہیں بتایا، مولوی صاحب نے بھی کوئی ترکیب نہیں بتائی۔ میں نے سوچا تو اب اللہ میاں سے دعا کرنی چاہیئے۔ بس یہ ترکیب ٹھیک ہے۔''

میں نے عشاء کی نماز پڑھی۔ نماز کے بعد خوب دل لگا کر اللہ میاں سے دعا کرنے لگا۔ اللہ میاں! آپ کے بس میں تو سب کچھ ہے۔ مجھے شیطان کو دکھا دیجئے۔ میں یہی دعا رٹے جا رہا تھا۔ اچانک ایک چمک سی ہوئی۔ اس سے میری پلک جھپک گئی۔ میں نے دیکھا کہ سامنے بہت سے لوگ اکٹھا ہیں، اور کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ اب جو میں نے ذرا غور سے دیکھا تو سب کی صورتیں بڑی ڈراؤنی دکھائی دیں۔ توبہ! میں نے دل میں کہا۔ ''یہ تو شیطان معلوم ہوتے ہیں۔''

میں دل میں یہ کہہ ہی رہا تھا کہ میری نظر ایک شیطان پر پڑی۔ یہ سب سے اونچی جگہ پر سب کا سردار بنا بیٹھا تھا۔ اور اپنے سب شیطانوں کی باتیں سن رہا تھا۔ میں نے دل میں کہا۔ ''ہو نہ ہو۔ یہ سب شیطان ہیں اور یہ جو گرو گھنٹال بیٹھا ہے۔ یہی خُرّانٹ ابلیس ہے۔ پھر مجھے یقین ہو گیا کہ سچ مچ یہ ابلیس ہی ہے۔ اور یہ سارے شیطان اس کے چیلے ہیں۔ میں نے ان سب کو اس طرح پہچانا کہ سارے شیطان اپنی اپنی مکّاریاں اُسے سنا رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ ہم نے اس اس طرح انسانوں کو بہکایا۔

میں نے دل میں کہا۔ ''اب تو سننا چاہیے ان کی باتیں۔'' میں چپکے دم سادھے ان کی طرف دیکھتا رہا اور سننے کے شوق میں اپنے کو ایسا بنا لیا جیسے میرا رُواں رُواں رونگٹا رونگٹا کان بن گیا ہو۔

ایک شیطان ابلیس کے سامنے اپنی رپورٹ پیش کر رہا تھا کہ کس طرح ایک دوکاندار کو بہکایا اور پھر وہ دن بھر کم تولتا رہا۔ دوسرا شیطان اپنی رپورٹ میں یہ بتا رہا تھا کہ کس طرح ایک مولوی صاحب کو روپے پیسے کا لالچ دلایا اور پھر ان کو بڑے مولوی صاحب سے لڑا دیا۔ وہ خوب جھوٹ بولے، اور نہ جانے کیا کیا بکے۔ اسی طرح ہر شیطان کسی نہ کسی بڑے آدمی کے بارے میں اپنی رپورٹ سنا رہا تھا۔ لیکن مجھے ان شیطانوں کی باتوں میں زیادہ دلچسپی نہیں ہوئی۔ اصل میں میں اس شیطان کی رپورٹ سننا چاہتا تھا، جو بچوں کو بہکاتا ہے اور پھر اُن سے بُرے کام کرا لیتا ہے۔

اچانک ابلیس نے ہاتھ اٹھا کر سب کو بولنے سے روک دیا اور بولا۔ ''ٹھیک ہے بڑوں کو بہکانے کا کام ٹھیک ہو رہا ہے۔ لیکن مجھے سب سے زیادہ دلچسپی بچوں سے ہے۔ ان کے بارے میں نہیں معلوم کہ وہ بڑے ہو کر کیا کریں گے۔ میری کوشش ہے کہ بچے بگڑ جائیں۔ اگر یہ بگڑ گئے تو پھر ہم سب کو آرام ملے گا۔ بچوں میں سے خود ہر ایک شیطان کا چچا ہو گا۔ اچھا اب آپ لوگ بچوں کے شیطان ''خنّاس'' کی رپورٹ سنئے۔''

ابلیس نے یہ کہا تو سارے شیطان ''ٹھیک ہے۔'' کہہ کر خاموش ہو گئے اور میں بڑے شوق سے دیکھنے لگا کہ ان میں سے ''خنّاس'' کون ہے؟

ایک طرف سے ایک بڑا اچنچل اور چُلبُلا شیطان اُٹھا۔ شرارت کا پُتلا معلوم ہوتا تھا۔ شوخی کوٹ کوٹ کر اس کی نس نس میں بھری تھی۔ کودتا، اچکتا آ کر بیچ میں کھڑا ہو گیا۔ اسے دیکھ کر سارے شیطان ہنسنے لگے۔

''ہاں خنّاس جی! کہو کیا حرکتیں کر کے آئے ہو؟'' ابلیس کے یہ کہتے ہی ''خنّاس'' نے اپنے نیفے میں سے لپٹا ہوا ایک کاغذ نکالا اور اس اس طرح پڑھنے لگا:

بسم النہار النغور الرغیم

''ایں! یہ کیا کہا۔ ادھر میں حیران اُدھر سارے شیطان ہنس کر بولے۔ ''ارے، بھئی خنّاس! یہ کون سی بولی چالو کی ہے؟''

خنّاس بولا۔ ''بھائیو! یہ کوئی بولی وولی تو ہے نہیں۔ نہ یہ زبان کہیں چالو ہے۔ لیکن اس طرح اوٹ پٹانگ بولی بچوں کو بہکانے میں خوب کام آتی ہے۔ بس میں اسی طرح بے سر پیر کی باتیں اڑاتا ہوں، بچوں کو مزا آ جاتا ہے اور پھر میں اُنھیں بُرے کاموں میں آسانی سے پھانس لیتا ہوں۔''

''یا اللہ'' میری زبان سے نکلا۔ مجھے یاد آیا۔ ایک دن ٹلّو میاں اسی طرح کی ایک نظم بنا کر لائے تھے اور ہم سب سن کر ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے تھے۔

''اچھا بھائی خنّاس، کوئی مزیدار نظم اسی بولی میں سنائیے۔'' ابلیس نے اور سارے شیطانوں نے فرمائش کی اور خنّاس نے مسکرا کر کہا۔ ''سنئے!'' اُدھر شیطانوں نے اور اِدھر میں نے کان لگا دیئے۔ خنّاس نے پڑھنا شروع کیا۔

نغُورُ النغاری نغیرٌ نغارا زغزوم زغزوم دم زغدّژ ژغارا
پدم دش دشانن بھبھشو بھبھوشٹ بھشا بھوش بھوشن بھشاری بھشارا

سارے شیطان ہنستے ہنستے دُہرے ہو گئے۔ ابلیس سے بھی ہنسی ضبط نہ ہو سکی۔ اس نے بھی اپنا پیٹ پکڑ لیا اور ادھر میں۔

ارے بھئی! میرا عجب حال تھا یہی نظم تو اس دن ٹلّو میاں ہم سب کو سنا رہے تھے۔ اچھا تو اس دن یہ خنّاس ہم سب کو لے ڈوبا۔

شیطانوں نے خنّاس سے کہا۔ ''ارے بھئی! ذرا اس کا مطلب تو فرماؤ!'' مطلب وطلب کچھ نہیں۔ سنئے تو! میں نے یہی نظم ایک بار ایک لڑکے کو سنا دی۔ وہ بچوں کے ایک جلسے میں جا رہا تھا۔ اس بچے کا نام تھا ٹلّو ......۔

''اُف توبہ!'' میں خنّاس کی حرکتیں اور باتیں زیادہ دھیان سے دیکھنے اور سننے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ٹلّو میاں نے یہ نظم بچوں کو سنائی تو لڑکے جلسے کی ساری اللہ والی باتیں بھولے اور آخر میں سب نے ٹلّو سے خوشامد کر کر کے یہ نظم لکھی۔ اور اب وہی لڑکے جو ہر وقت ''اللہ اللہ کرو، اپنے رب سے ڈرو'' والی نظم پڑھا کرتے تھے۔ اس زٹل کو رٹا کرتے ہیں۔ خداوندا ابلیس نے چاہا تو جب تک یہ زٹل بچوں کو یاد رہے گی اُس وقت تک نہ تو اُنھیں سبق یاد ہوگا اور نہ اپنے بڑوں کی نصیحت پر کان دھریں گے۔''

''اچھا او بدمعاش! ٹلّو کے بھیس میں تو تھا۔ خدا تجھ سے بچائے۔'' مجھے خنّاس سے خوف معلوم ہونے لگا۔ میں نے دل میں لاحول پڑھی۔ ابلیس اور سارے

شیطان ''واہ وا، خوب خوب کیا کہنا'' کہہ کہہ کر تعریف کر رہے تھے اور خنّاس اپنی رپورٹ پڑھنے لگا تھا۔

''یَا اَھلَ النَّار !(اے آگ والو!) ایک دن میں نے دیکھا۔ کچھ لڑکے میدان میں کھیل رہے تھے۔ بڑے قاعدے اور تہذیب کے ساتھ ہر کھیل کھیلتے تھے۔ بھلا میں لڑکوں کو تہذیب کے ساتھ کھیلتے دیکھوں اور مجھے اچھا لگے۔ بھائیو! مجھے بڑا ہی بُرا لگا۔ میں سوچنے لگا۔ ''کیا جتن کروں؟'' اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک گدھا ایک طرف چَر رہا تھا۔ بس میں نے اس کو پکڑا۔ ایک طرف ایک پیپا پڑا تھا۔ اُسے اُٹھایا اور گدھے کی دُم میں باندھ دیا۔ کود کر اُس پر بیٹھا اور میدان میں دوڑا دیا۔

لڑکوں نے دیکھا تو میں نے ایک لڑکے کو اشارہ کر دیا۔ اس لڑکے نے دوسرے کو اور دوسرے نے تیسرے کو۔ پھر تو سب لڑکے گدھے پر پل پڑے۔ کوئی گدھے کی پیٹھ پر سوار ہوا۔ کسی نے گدھے کی دُم پکڑی۔ کوئی اُسے چھڑی مارنے لگا۔ اب گدھا بھاگا۔ تو پیپا اس کی ٹانگوں سے ٹکرایا، لڑکوں کو بڑا مزا آیا۔ میں تو چپکے سے کھسک گیا۔ لیکن پھر تو کوئی لڑکا گرا۔ دو چار کے گدھے نے لات ماری، کسی کو کاٹا اور ان کا وہ اچھا کھیل تہس نہس ہو کر رہ گیا۔''

''واہ وا، واہ وا۔'' ابلیس اور سارے شیطان خوش ہو گئے۔ لیکن میں اپنی جگہ جل کر رہ گیا۔ خنّاس نے آگے رپورٹ پڑھی۔

''وہاں سے ہٹ کر ایک طرف چلا تو دیکھا ایک لڑکا جا رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں پچیس پیسے کا سکّہ اور تھیلا تھا۔ میں اس کے پیچھے چلا اور لڑکے کو بہکانے لگا۔ میں

نے کہا۔ ’’ارے میاں! پندرہ پیسے کے آلو لینا اور دس کی چاٹ اڑانا۔‘‘ وہ لڑکا میرے داؤں میں آ گیا اور اس نے دس پیسوں کی چوری کی۔ وہاں سے آگے بڑھا تو کچھ لڑکوں کو وضو کرتے دیکھا۔ میں نے سوچا ان کو بہکا دیا تو بڑا کام کیا۔ میں بھی ان کے ساتھ جا کر وضو کرنے لگا۔ وضو کرتے کرتے پانی اچھال دیا اور قہقہہ لگایا۔ ’’ہاہاہاہا۔‘‘ وہ لڑکے مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے ایک لڑکے کی مت ماری۔ اس نے میری نقل کی۔ اس کا پانی ایک اور لڑکے پر گرا اس نے بدلہ لیا۔ پھر دونوں لڑنے لگے۔ کچھ لڑکوں نے ایک کی طرف داری کی کچھ نے دوسرے کی۔ پھر تو سب نے ایک دوسرے کو ایسا لت پت کیا کہ مزا آ گیا۔ میں خوش ہو گیا کہ چلو کام بن گیا۔ اب یہ لڑکے نماز کیا پڑھ سکیں گے۔ جب تک کپڑے بدلیں گے، مغرب کا وقت ختم ہو جائے گا۔

اب رات ہو گئی۔ میں ایک گھر میں گھس گیا۔ اس گھر میں کئی لڑکے لڑکیاں بیٹھے ہوئے کہانیاں کہہ رہے تھے۔ میں بھی ان کے بیچ جا بیٹھا۔ وہ لڑکے نبیوں کے قصے بیان کر رہے تھے۔ مجھے بڑا بُرا لگا۔ میں نے بہکایا۔ کوئی ہنسنے ہنسانے والی کہانی ہوتی۔ تو مزا آتا۔ ایک بڑے لڑکے نے کہا۔ ’’نہیں، یہی قصے ہوں گے۔‘‘ لیکن بھنّو بی میرے ڈھب پر آ گئیں۔ پھر تو انھوں نے خوب خوب جھوٹی کہانیاں سنائیں۔ لونا چماری کا قصہ، موت کی کہانی، تنگڑم خاں، باگڑ بلّا، اگڑم بگڑم اور نہ جانے کس کس کی کہانی سنا ڈالی انھوں نے۔ میں نے سوچا اب چلو، کہیں اور ایک دوسرے گھر میں گھسا۔ دو بہن بھائی ایک پلنگ پر لیٹے تھے۔ پیار اور محبت کی باتیں کر رہے تھے۔

میں نے چھوٹے بچے کو بہکایا۔ اس نے کہا۔ ”آپا! تکیہ میری طرف تو کر دو۔“ اُدھر آپا جان کو بھی میں نے گدگدایا۔ انھوں نے چھوٹے بھائی کو ڈانٹ دیا۔ ”میرا ہی تو تکیہ ہے۔“ دو تین منٹ کے اندر ان دونوں کو لڑا کر میں وہاں سے کھسک گیا۔

اس طرح میں نے ایک ایک دن میں اَن گِنت لڑکوں کو بہکایا۔ کچھ کو لڑا دیا، گالی گلوچ کرائی۔ لڑکوں نے میرے کہے میں آ کر چوریاں کیں۔ ایک دوسرے کی چیزیں چھینیں۔ لیکن ایک لڑکا ایسا ملا جو اب تک میرے داؤں میں نہ آیا۔“

”وہ کون؟“ ابلیس بولا۔

”حضور! اس کا نام ہے رشاد۔“

”رشاد کون رشاد؟“ میرا دوست رشاد!!“

میں خنّاس کی رپورٹ بڑے دھیان سے پھر سننے لگا۔ خنّاس نے بتایا۔

”حضور! رشاد کی عمر زیادہ نہیں ہے۔ یہی بس دس بارہ برس کا ہے۔ ایک اسلامی جماعت کی درسگاہ کے درجہ ٦ میں پڑھتا ہے۔ میں نے اس پر کئی داؤں کئے۔ ایک بار وہ اسکول جا رہا تھا۔ میں نے اس کے آگے دس روپئے ڈال دیئے۔ اس نے دیکھا تو اٹھا لیا۔ میں خوش ہو گیا۔ لیکن میری خوشی ذرا دیر کی تھی۔ رشاد گھر گیا اور پھر جب لوٹا تو اس نے روپئے وہیں لا کر ڈال دیئے۔ میں نے بڑھ کر پوچھا۔ ”کیوں یار، یہ روپئے کیوں پھینک دیئے؟“ اس نے بتایا کہ امّی بہت ناراض ہوئیں۔ اور کہنے لگیں کہ کہیں کوئی چیز پڑی دیکھو تو مت اٹھاؤ۔ اللہ میاں خفا

ہوتے ہیں۔ پیارے رسولؐ نے روکا ہے۔

میں نے پھر بہکانا چاہا۔ ''یار! لے جاؤ تمہاری امّی کیا جانیں؟'' تو رشاد بولا۔ واہ! امّی نہیں دیکھتیں تو کیا اللہ میاں تو دیکھ رہے ہیں۔ پھر اس نے لاحول پڑھی۔ لاحول سن کر میں وہاں سے بھاگا۔''

اب تو میں اس کا اور بھی دشمن ہوگیا۔ میں نے دل میں ٹھان لیا کہ میاں رشاد کو چت نہ کیا تو کچھ نہ کیا۔ میں نے اپنے بھائی وسواس کو مدد کے لئے بلایا۔ اب چلے ہم دونوں۔ رشاد ایک جگہ ملا۔ ہم دونوں نے بڑھ کر کہا۔ ''السلام علیکم'' اس نے جواب دیا۔ ''وعلیکم السلام'' ہم نے کہا۔ ''کہاں جارہے ہو یار؟'' بولا'' آج ہماری درس گاہ کے سامنے والے اسکول میں جھگڑا ہوگیا۔ جاہل خاں نے میرے سامنے رمیش کو گالی دی اور پھر خود ہی مارا اور پھر مسلمان لڑکوں کو بھڑکا دیا اور پھر سارے مسلمان جاہل خاں کی طرف ہوگئے اور یہ دیکھ کر ہندو لڑکے رمیش کی طرف ہوگئے۔''

''ہاں ہاں ٹھیک ہے یار!'' میں اور وسواس دونوں نے ایک ساتھ کہا۔ ہم دونوں کو معلوم ہی تھا۔ ہماری ہی سوچی سمجھی حرکت تھی وہ۔ ہم نے رشاد سے کہا:

''تو بھائی! تم بھی مسلمان ہو مسلمانوں کی طرف داری کرو۔''

''نہ، ہرگز نہیں۔ میں حق بات کہوں گا۔ ماسٹر صاحب نے مجھے بلایا ہے۔ اسکول کے ہندو لڑکے کہہ رہے ہیں کہ رشاد میاں جو کچھ کہیں گے ہم وہی مانیں گے۔''

''ارے یار! سارے مسلمان لڑکوں کی ناک کٹواؤ گے۔''

''ناک کٹے یار رہے۔''

’’تم کو اسلام پیارا نہیں؟‘‘ ہے کیوں نہیں۔ اسلام ہی تو حکم دیتا ہے کہ حق بات کہو چاہے اپنا ہی نقصان ہو۔ پیارے رسولؐ نے جھوٹی گواہی دینے والے پر لعنت کی ہے۔‘‘

’’مگر تمہیں تو مسلمانوں کی طرف داری ہر حالت میں کرنی چاہئے۔‘‘

’’ہرگز نہ کروں گا۔ میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکموں کے خلاف نہ کروں گا۔‘‘

’’تو یار ایسا کیوں نہ کرو کہ گواہی نہ دو۔‘‘

’’واہ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ ماسٹر صاحب نے بلایا ہے۔ پھر مجھے امید ہے کہ میں سچ سچ کہہ دوں گا جھگڑا مٹ جائے گا۔‘‘

’’مگر پھر جاہل خاں سے کیسے نمٹو گے۔‘‘

’’اللہ مالک ہے۔‘‘

اب تو میں اور وسواس گھبرائے۔ وسواس نے ایک چال اور چلی۔ اس نے کہا:

’’رشاد! تم بڑے سچے بچے ہو۔‘‘

’’یہ اللہ کی مہربانی ہے۔‘‘ رشاد بولا اور وسواس کا یہ داؤں بھی خالی گیا۔

’’بات یہ ہے کہ رشاد میاں کو علم ہے کہ بُرائی کرنا بُری بات ہے۔ بس وہ علم کی بدولت ہی برائی سے بچتے ہیں۔‘‘ میں نے کہا۔ میرا خیال تھا کہ رشاد میاں اب باتوں میں آجائے گا اور اپنی تعریف سن کر بہک جائے گا۔ رشاد میاں اپنی تعریف سن کر بولا۔ ’’کچھ نہیں جی۔ اگر اللہ کی مہربانی نہ ہو تو نہ علم بُرائی سے بچا سکتا ہے نہ یار دوست اور نہ کوئی اور۔ تم دونوں میرے منہ پر میری تعریف کر رہے ہو تو مجھے لگتا

ہے کہ تم دونوں شیطان ہو۔ جی چاہتا ہے کہ مٹھی بھر ریت اٹھا کر تمہارے منہ میں بھر دوں۔" ساتھ ہی لاحول پڑھی۔ "لاحول سنتے ہی ہم دونوں بھاگے اور سیدھے آپ صاحبان سے مدد لینے دوڑے۔ مجھے امید ہے کہ خداوند ابلیس ہمیں ایسی تدبیر بتائیں گے کہ ہم رشاد کو پچھاڑ سکیں گے۔"

خنّاس یہ کہہ کر چپ ہو گیا۔ میں اپنی جگہ دنگ رہ گیا۔

"یا اللہ! یہ خنّاس تو رشاد کے پیچھے پڑا ہے۔" اب میں نے دیکھا کہ ابلیس نے پہلو بدلا۔ کہنے لگا۔

"دیکھو خنّاس! رشاد کو بہکانا آسان بات نہیں ہے۔ رشاد کے ماں باپ اسے ہر وقت قرآن اور حدیث کی باتیں بتایا کرتے ہیں۔"

"مگر یا ابلیس! آپ ہمارے استاد ہیں۔ آپ میری مدد کریں۔"

"میں ضرور تمہاری مدد کروں گا۔ ایسا کرو کہ رشاد کے ماں باپ کو بہکایا جائے۔ وسواس ان کے دل میں یہ ڈالے کہ رشاد کو دینی درسگاہ میں پڑھانے سے کیا فائدہ۔ نہ تو نوکری ملے گی نہ کچھ۔ اگر وسواس اس میں کامیاب ہو گیا تو پھر رشاد درسگاہ سے کالج کا رخ کرے گا۔ پھر تو وہ خود ہی شیطان بن جائے گا اور ہماری برادری میں ایک تیز طرّار شیطان بڑھ جائے گا۔"

"بہت خوب یا استاد! سارے شیطان خوش ہو گئے۔ اور سب یہ کہہ کر اٹھے کہ چلو رشاد میاں کے ماں باپ سے چل کر کہیں کہ رشاد بڑا تیز اور سمجھ دار ہے اسے کالج میں پڑھوائیے۔ خاندان کا نام اونچا کرے گا۔ شیطان کا اٹھنا تھا کہ دھوئیں کی

آندھی اٹھی۔ میں گھبرا گیا اور زور زور سے چیخنے لگا۔ ''امی! امی جان!

''ارے، ارے بیٹا! کیا خواب دیکھ رہے ہو؟'' امی جان مجھے پکڑ کر بلا رہی تھیں۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ ''ایں کیا میں خواب دیکھ رہا ہوں میں جانماز پر ہی سو گیا تھا۔'' جلدی سے آنکھیں مَلتا ہوا اٹھ بیٹھا۔ امی جان سے سارا قصہ بیان کیا۔ امی جان نے کہا۔ ''اللہ سے مدد مانگو اور پڑھو لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔''



عید کا جوڑا

''میں یہ ٹوپی تو نہیں، یہ پھولوں والی ٹوپی لوں گا۔''

''اچھا بھئی یہی لے لو۔'' اور ابا جان نے پھولوں والی ٹوپی سعید کو خرید دی۔ وہاں سے اٹھے تو ہم سب جوتوں کی دکان پر گئے۔ وہاں بھی سعید نے نہ جانے کتنے جوڑے نکلوا کر ایک پسند کیا اور اسی پر اَڑ گیا۔ ابا جان نے اس کی پسند کا جوتا بھی لے دیا۔

عید کے کئی دن باقی تھے۔ سعید کرتہ، ٹوپی، رومال وغیرہ کے لئے ایک شور مچائے ہوئے تھا۔ لیکن جب اس کا یہ سب کچھ آ گیا اور اس نے دیکھ بھال کر خوشی خوشی رکھ بھی لیا تو دوسرے دن سے نہ جانے کیوں اداس رہنے لگا۔ میں نے اسے چپ چپ دیکھا تو امی جان سے ذکر کیا۔ انھوں نے ابا جان سے کہا۔ سب نے مل

کر سوچا مگر کوئی بات نہ سمجھ سکا کہ سعید نے اپنی پسند کی چیزیں پانے پر کیوں چپ سادھ لی ہے اور کیوں اتنا اداس رہنے لگا ہے۔

دو ایک بار میں نے پوچھا بھی۔ لیکن وہ کچھ نہ بولا۔ آخر ایک دن امی جان نے بہلا پھسلا کر پاس بٹھایا۔ بولیں۔ ''سعید میاں کی ٹوپی سب سے اچھی ہے، ہے نا سعید میاں!'' لیکن سعید نے کوئی دلچسپی نہ لی۔ اب میں نے کہا۔ ''جوتا بھی تو بھڑک دار ہے، اس میں موتی بھی تو ٹکے ہیں۔'' میری بات سنی تو کھسیانی ہنسی ہنسنے لگا۔ اب راشدہ باجی کی باری تھی انھوں نے کہا:

''اور میں نے سعید میاں کا رومال کیسا اچھا کاڑھا ہے، کیسے کیسے رنگ برنگے پھول بنائے ہیں۔''

اس کے بعد ابا جان نے پھر کچھ کہا۔ پھر چھوٹی اپیا نے، پھر پھوپھی جان نے۔

سعید اس طرح کی باتوں سے ہمیشہ خوش ہوتا تھا اور سب سے زیادہ اپنی چیزوں کی تعریف کرتا تھا اور کسی کو ہاتھ لگانے نہ دیتا تھا۔ لیکن آج پہلے تو سن کر اداس اداس ہنسی ہنسا، پھر نہ جانے اسے کیا سوجھی وہ اٹھا، جلدی جلدی گیا اور اپنا عید کا جوڑا لا کر امی جان کے آگے ڈال دیا، اور ساتھ ہی بولا:

''میں نہیں پہنتا یہ جوڑا۔'' اور پھر رونے لگا۔

اب تو ہم سب کو بڑی پریشانی ہوئی۔ اس وقت خفگی کی کوئی بات بھی نہ تھی۔ چھوٹی اپیا نے بھی اسے نہ چھیڑا تھا۔ لیکن آخر کچھ نہ کچھ ہوا ہوگا۔ مجھ سے پوچھا گیا، باجی سے اپیا سے سب سے ابا جان نے پوچھا۔ کوئی کچھ نہ بتا سکا۔ تو ابا جان نے

پیار کے ساتھ کہا۔ ''ہم اس سے اچھا جوڑا سعید میاں کو بنوا دیں گے۔''

سعید کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ ابا جان نے کچھ سوچ کر کہا۔

''ہاں بیٹے بتاؤ نا، اس جوڑے کو کیا کرو گے؟'' سعید نے ابا جان کو دیکھا۔

''بتاؤں؟......اچھا نہیں بتاؤں گا۔''

اب سب لوگ سمجھ گئے کہ بس اسی بات میں کوئی بات ہے۔ امی جان نے اسے چمکارا اور پھر پوچھا۔ ''ہاں بیٹے! یہ جوڑا......'' وہ پوری بات نہ کہہ سکی تھیں کہ سعید میاں بیچ ہی میں بول اٹھے:

''امی! پھر یہ جوڑا راشد کو دے دوں؟''

''کون سے راشد کو؟'' ابا جان نے پوچھا۔

''ابا جان! میرا دوست راشد۔ وہ جو کل آیا تھا۔ میں نے اسے اپنی ٹوپی دکھائی۔ رومال دکھایا، کرتہ دکھایا، وہ بیٹھا دیکھتا رہا۔ پھر میں نے اس سے پوچھا۔ ''راشد تمہارا جوڑا کیسا بنا؟'' میرے یہ پوچھنے پر وہ رونے لگا۔

''اچھا یہ بات ہے، ہم لوگ سمجھ گئے۔ راشد بے چارہ یتیم بچہ۔ اس غریب کو کس نے جوڑا بنا کے دیا ہوگا۔ بس اسی کا اثر ہے سعید پر۔

پھر کیا تھا۔ ایک چھوٹے سے بچے کی اس ذرا سی بات کو ہم بڑوں نے بہت کچھ سمجھ لیا۔ پھر باجی نے، اپیا نے مل کر جلدی جلدی کرتہ رومال اور پائجامہ تیار کیا۔ ابا جان ٹوپی اور جوتہ لائے۔ پھر؟

پھر کچھ نہ پوچھئے سعید کی خوشی! عید میں جب راشد نے سعید میاں کے ساتھ

جوڑا پہنا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سعید میاں کو جنت مل گئی اور سعید میاں ہی کو کیا، ہمیں بھی عید کی سچی خوشی اس دن ہوئی۔ ہم سب نے سعید میاں کو خوب دعائیں دیں۔



پتھر سے ہیرا

اس دن ہم سب نے جلدی جلدی کھانا کھایا اور بھائی جلدی جلدی کیا، یوں سمجھئے کہ کھانے کا نام کرلیا اور جھٹ بابا کے کمرے میں پہنچ گئے۔ بابا نے ہم سب سے کہا تھا کہ پتھر سے ہیرا والی کہانی سنائیں گے۔

بابا ہمارے گھر بھر کے بابا تھے۔ بابا کس رشتے سے ہمارے بابا تھے؟ یہ بات ہم نہیں جانتے تھے۔ ہم تو سنتے تھے کہ بھائی جان انھیں بابا کہتے، بڑی آپا انھیں بابا کہتیں۔ پھوپھی جان بھی انھیں بابا کہتیں۔ امی جان کے بھی وہ بابا تھے اور ابا جان کے بھی۔ اور بھائی یہ بات ہمارے گھر تک ہی نہیں تھی۔ محلے بھر کے بچے جوان اور بوڑھے، مرد، عورتیں سب انھیں بابا ہی کہتے۔ بابا اتنے بوڑھے تھے...... کہ ان کی بھویں تک سفید ہو چکی تھیں۔ ان کی عمر کے بارے میں تو ہم کچھ کہہ ہی نہیں سکتے تھے۔ ایک بار ہم نے امی جان سے پوچھا بھی تھا تو انھوں نے بتایا کہ میں نے اس گھر میں جب سے قدم رکھا ہے، بابا کو یوں ہی دیکھا ہے۔

پھر ابا جان سے پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ ”بابا کو ابا مرحوم کہیں سے اپنے

ساتھ لے آئے تھے۔ پھر بابا ہمارے گھر سے نہیں گئے۔''

تو بھائی یوں سمجھئے کہ بابا بہت ہی بوڑھے تھے اور کمزور بھی۔ وہ لاٹھی ٹیک کر دو قدم چلتے تو تھک جاتے۔ لیکن باتیں کرتے تو گھنٹوں بولتے رہتے اور زبان نہ تھکتی۔ معلوم ایسا ہوتا تھا جیسے سارے بدن کی طاقت سمٹ کر اُن کی زبان ہی میں آ گئی ہو۔ ان کے پاس یہی زبان ایک ایسی چیز تھی جس کی وجہ سے ہم سب اور ہمارے محلے کے چھوٹے بڑے تمام لوگ ان پر جان چھڑکتے تھے۔ بڑے ان کی نصیحتوں کے موتی چنتے اور ہم سب مزے دار کہانیاں سنتے۔ بابا ایسی ایسی نئی اور پرانی کہانیاں کہتے کہ ہم سب حیران رہ جاتے۔ ہم سب سوچا کرتے کہ بابا کو سچ مچ یہ ساری کہانیاں یاد ہیں، یا وہ بناتے جاتے ہیں اور کہتے جاتے ہیں۔ اِدھر ہم نے ہُنک کر کہا۔ ''بابا کہانی!'' اُدھر شروع ہو گیا۔ ''ایک تھا بادشاہ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔'' یا ''ایک تھی چڑیا یا پھر بولتی مینا کی کہانی یا سونے کے مکان کی کہانی یا گل بادشاہزادی کی کہانی یا شاہزادے نور افشاں کی کہانی یا مٹھائی کے کارخانے کی کہانی۔ بھائی ہم کہاں تک گنائیں۔ ہم کو یاد نہیں کہ جتنی کہانیاں بابا سے سن چکے ہیں۔ مگر بابا ہیں کہ جیسے ان کے پاس کہانیوں کی پٹاری ویسی کی ویسی بھری ہو۔''

ایک دن کہیں رفّو نے سن لیا کہ ہمارے بابا سگے بابا نہیں ہیں۔ دادا جان انھیں لائے تھے۔ بس وہ لیڈر بن کر ہمیں اس بات پر ابھارنے لگی کہ بابا سے پوچھا جائے۔ وہ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ ان کا نام کیا ہے؟ دادا جان کو کہاں ملے؟ اور پھر ہمارے گھر کس طرح آ گئے؟ رفّو اسی طرح کے بہت سے سوال ہم سب کے

سامنے کرتی اور کہتی چلو چل کر بابا سے پوچھیں لیکن ابا، امی اور محلے کے سبھی لوگ بوڑھے بابا کا اتنا ادب کرتے کہ ہماری ہمت نہ ہوتی۔ آخر رفو کو موقع مل گیا۔ ایک دن بابا نے کہا۔ اچھا بھئی سنو ''پتھر سے ہیرا'' والی کہانی۔ رفّو نے چمک کر کہا۔ ''بابا آج تو آپ بیتی سنائیے۔'' بابا نے ایک نظر رفو کو دیکھا۔ پھر ایک لمبی سانس لی اور بولے ''پتھر سے ہیرا'' والی کہانی آپ بیتی تو ہے ہی۔ لو سنو۔

''ایک تھی بڑھیا، اس کا ایک تھا لڑکا......۔''

''نہ بابا بڑھیا کی کہانی نہیں، آپ بیتی سنائیے۔'' ایک دم رفّو چیخی۔ بابا نے کہا۔ ''ارے بھئی میں آپ بیتی ہی تو کہتا ہوں۔ اس بڑھیا کا لڑکا میں ہی تو ہوں۔''

''لل کا'' پپو پاس بیٹھی تھی۔ اس نے تعجب کے ساتھ بابا کو دیکھا۔ تتلا کر بولی:

''آپ لل کے کب ہیں؟'' لیکن ہم سب نے پپّو کو چپ کر دیا۔ بابا کہنے لگے:

''اچھا بھئی، یوں سہی۔ میں جب چھوٹا بچہ تھا...... اتنا چھوٹا جتنا چھوٹا یہ کوکو نوری ہے۔ بس یہی لگ بھگ دس برس کا۔'' بابا اس وقت آپ کے داڑھی تھی؟'' رفّو نے اچانک سوال کیا اور سارے لڑکے قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔

نغمہ نوری نے رفّو کو سمجھایا کہ اری رفو! بچوں کے داڑھی نہیں ہوتی۔ داڑھی تو ابا جان کے نکلتی ہے۔ نغمہ نوری کی بات پر ہم سب کو اور بھی مزا آ گیا۔ ہم نے کہا۔ ''اچھا آپ دونوں بہت سمجھ دار ہیں بس چپ رہئے اور کہانی سنئیے۔ ہاں تو بابا آپ دس برس کے تھے، پھر کیا ہوا؟ بابا پھر کہنے لگے۔

بھئی ہوا یہ کہ میری ماں بوڑھی تھی۔ میرے باپ مر چکے تھے۔ اور کوئی میرے

گھر میں تھا نہیں۔ ماں کام کاج کو جاتی، مجھ سے کہہ جاتی کہ یہ کام کرنا، وہ کام کرنا۔ لیکن میں کچھ نہ کرتا۔ یہاں کھیلا، وہاں کودا۔ بس کھیل کود ہی کیا کرتا۔ ایک دن میرے گھر میں ایک لڑکے کی گیند آ کر گری۔ میں نے جھٹ اسے چھپا دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ لڑکا آیا۔ اس نے پوچھا تو میں نے کہہ دیا کہ تمہاری گیند میں نے باہر پھینک دی جا کر لے لو۔

''یعنی آپ جھوٹ بول دیئے بابا۔'' صفّو نے پوچھا اور بابا نے بڑی دکھ بھری آواز کے ساتھ جواب دیا۔ ''ہاں بیٹی! ٹکے کی گیند کے لئے جھوٹ بول دیا میں۔ اور بس اسی جھوٹ سے برائیوں کا دروازہ کھل گیا۔ وہ پرسوں جمعہ کے دن مولوی صاحب والی بات کیسی سچی تھی کہ ایک شخص نے جھوٹ بولنا چھوڑ دیا تو اس کی ساری برائیاں چھوٹ گئیں۔'' ''بابا، بابا'' شوکت کہنے لگا۔ سنیئے تو وہ بات مولوی صاحب کی نہیں تھی۔ وہ پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتوں میں سے ایک بات ہے۔ مولوی صاحب نے اپنے وعظ میں وہی حدیث دہرائی تھی کہ ایک آدمی میں چار برائیاں تھیں۔ اُس نے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا۔ ''میں ان میں سے ایک آپ کے کہنے سے چھوڑ سکتا ہوں۔'' آپؐ نے فرمایا۔ ''جھوٹ بولنا چھوڑ دو۔'' تو اس نے جھوٹ بولنا چھوڑ دیا۔ پھر چوری کرنے کا خیال آیا کہ اگر پیارے رسولؐ نے پوچھا: چوری تو نہیں کی؟'' تو کیا جواب دوں گا۔ بس وہ چوری سے باز آ گیا۔ اسی طرح باقی برائیاں بھی چھوڑ دیں۔ بابا یہی تو بات تھی نا!''

شوکت چپ ہوا تو اکبر بولا۔ ''اچھا شوکت میاں! اب تم کہانی کہہ لو۔ بابا کو آپ بیتی نہ کہنے دو۔'' حامد نے بھی اکبر کی ہاں میں ہاں ملائی۔ بابا بولے۔ خیر شوکت نے بات اچھی کہی۔ اس میں بُرا ماننے کی کیا بات ہے؟

اچھا سنو۔ میں نے گیند کے لالچ میں پہلے پہل جھوٹ بات منہ سے نکالی۔ پھر ماں گھر میں آئی اور مجھ سے پوچھا۔ ''گیند تو کہاں سے لایا؟'' میں نے سارا حال کہا تو ماں نے مجھے کچھ نہ کہا۔ بس میری ہمت بڑھ گئی۔

''کس بات کی ہمت بڑھی بابا!'' سعید میاں نے پوچھا۔ ''سنے جاؤ۔ سب سمجھ میں آجائے گا۔'' بابا نے سعید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ اور پھر کہانی کہنے لگے۔

''میں دوسرے دن اپنے گھر ہی میں اس گیند سے کھیل رہا تھا۔ ایک بار زور سے دیوار پر گیند ماری تو وہ اُچھل کر دوسرے گھر میں جا گری۔ میں دوڑا، گیند نوران کے گھر میں جا گری تھی۔ میں دندناتا نوران کے گھر چلا گیا۔ گیند ڈھونڈنے لگا۔ گیند مرغیوں کے دربے کے پاس پڑی تھی۔ اسی جگہ مرغی نے انڈا دیا تھا، وہ بھی وہیں پڑا تھا۔ میں نے گیند تو لی ہی، وہ انڈا بھی اٹھالیا۔ ماں کو لاکر دے دیا۔ میری ماں نے پھر کچھ نہ کہا۔

''الے بے پوچھے لےلیا۔ اللہ میاں نالاج نئیں اُوئے۔'' پپّو نے تتلا کر کہا۔ بابا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ بولے۔ ''بیٹی! ہاں بے پوچھے انڈا اٹھالیا۔ تم سمجھو میں نے چوری کی۔ چور سے تو اللہ میاں ناراض ہوتے ہی ہیں۔ اللہ میاں مجھ سے ضرور ناراض ہو گئے۔''

''پھِل مالا تو نئ، آپ توبہ کل لیتے۔'' پپّو نے پھر کہا اور بابا پھر روانسے ہو کر

بولے۔ ''بیٹی! اللہ میاں کی مار دکھائی تو نہیں دیتی۔ پھر میں بڑی بڑی مصیبتوں میں پھنس گیا۔ کیا اچھا ہوتا کہ میں اسی وقت توبہ کرلیتا۔ یا میری ماں مجھے سمجھا دیتی کہ چوری کرنا بُری بات ہے۔ یہ کہہ کر بابا چپ ہو گئے اور دیر تک خاموش رہے۔ انھیں اپنے بچپن کا زمانہ یاد آ گیا تھا۔ وہ اسی میں کھو گئے۔ پھر رفّو نے چونکایا تو آگے کہانی شروع کی۔

'جھوٹ بولنے اور گیند چرانے پر میری ماں نے کچھ نہ کہا اور انڈا اڑالانے پر بھی انھوں نے کچھ نہ سمجھایا۔ تو پھر میں بچہ تو تھا ہی۔ میری ہمت بڑھ گئی اور پھر میں نے یہ کیا کہ ایک عورت کی مرغی جو کھنڈر میں چگ رہی تھی، میں نے اسے پکڑ لیا اور بازار میں بیچ دیا۔ دو روپئے ملے۔ دو روپئے میں نے اسی دن خرچ کر ڈالے۔ چاٹ کھائی۔ کچالو کھائے، آئس کریم کھائی اور کچھ کھیل تماشوں میں اڑا دیا۔ شام تک دو کے دونوں روپئے برابر کر دیئے۔ مزا آ گیا۔ دوسرے دن پھر پیسوں کی تلاش میں نکلا۔ کہیں کچھ ہاتھ نہ لگا تو گھر کی بالٹی اٹھا لے گیا اور اسے آٹھ آنے میں بیچا۔ ماں نے پوچھا تو میں نے کچھ نہ بتایا۔ وہ سمجھیں کہ چوری ہو گئی۔ پھر ایک دن لوٹا لے گیا۔ روز بروز کوئی نہ کوئی چیز گھر سے لے جانے لگا۔ اب ماں کو پریشانی ہوئی تو وہ اب میری تاک میں بیٹھیں۔ ان کے جمع کئے ہوئے دس بارہ روپئے رکھے تھے۔ میں نے وہ چرائے تو ماں نے موقع پر جھٹ آ پکڑا اور مجھے خوب مارا۔ روپئے چھین لئے اور مجھے گھر سے نکال دیا۔''

گھر سے نکال دینے سے میں ٹھیک نہ ہوا۔ میں سوچنے لگا کہ کیا کروں۔ رات کو

ایک کنویں پر پڑ کر سو گیا۔ آدھی رات گئے ادھر سے چور گذرے مجھے دیکھا تو جگایا اور حال پوچھا۔ میں نے سب کہہ دیا تو چور اپنے ساتھ لے گئے اور اسی رات میں ایک جگہ نقب لگائی اور بھاری رقم چرائی۔ دس روپئے مجھے دیئے اور اپنے ساتھ رکھ لیا۔ چوروں کے ساتھ اب میں چوری کرنے لگا۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں شاطر چور ہو گیا۔

''شاطر؟''

''یعنی بہت ہی بڑا چور بابا!'' میں نے پوچھا۔ بابا نے کہا۔ ''ہاں بیٹے! بہت بڑا چور۔ نقب لگانا، تالے توڑنا، دیواریں پھاندنا سب میرے لئے کوئی بات ہی نہ رہی۔ ایک بار ایک گھر میں چوری کرنے گھسا۔ گھر کے لوگ جاگ گئے۔ ان کے جاگنے پر میرے ساتھی چور بھاگ گئے۔ اکیلا میں گھر میں رہ گیا۔ چھپنے کی تدبیر سوچتا رہا۔ آخر میں ایک چھت کی کڑی سے جا چپکا۔ گھر کے لوگوں نے کونا کونا دیکھا بھالا۔ چھت کی طرف کسی کا دھیان ہی نہ گیا۔ گھر کے لوگ پھر سو گئے۔ تو میں دبے پاؤں نکلا۔ سوچا، زینے سے چڑھ کر چھت سے پھاند جاؤں۔ چھت پر پہنچا تو وہاں گھر کے چار آدمی لیٹے تھے۔ وہ چاپ پاتے ہی چونکے اور چاروں نے یکبارگی مجھے چھاپ لیا اور آن کی آن میں بے بس کر دیا۔ شور وغل ہوا تو گھر اور باہر کے لوگ جمع ہو گئے۔ پولیس کے سپاہی بھی آ گئے۔ وہ پکڑ کر چوکی پر لے گئے۔ مجھ سے میرے ساتھی چوروں کا اتہ پتہ پوچھا۔ میں نے کسی کا نام نہیں بتایا۔ سپاہیوں نے مجھے بہت مارا۔ خوب ہی پیٹا۔ بندوقوں کے کندوں کی چوٹ دی۔ لیکن میں نے صاف کہہ دیا کہ میں اکیلا چوری کرنے گیا تھا۔ پولیس کہاں تک مارتی۔ آخر سپاہی

تھک گئے۔ پھر مقدمہ چلا تو مجھے سال بھر کی سزا ہوئی۔

''اچھا بھائی! تو مجھے جیل ہوگئی۔ جیلر بڑا کٹّر دل کا آدمی تھا۔ اور بھئی ہوتا بھی ہے جیلر کٹّر دل کا۔ اگر وہ کٹّر پن سے کام نہ لے تو چوروں، ڈاکوؤں، بدمعاشوں کو ٹھیک کیسے رکھے۔ اچھا تو میرا جیلر بھی ایسا ہی تھا۔ حاضری میں ذرا دیر ہو جاتی تو سڑاک سے اس کا بید چل پڑتا۔ ذرا بان کم بٹے جاتے تو وہ ٹھوکر مارتا کہ چھٹی کا دودھ یاد آجاتا۔ چکی پیسنے میں کچھ بھی آٹا کم پیسا جاتا تو ہنٹر بازی شروع کر دیتا۔ وہ مار پڑتی کہ توبہ بھلی۔ مگر بھائی! یہ قیدی بھی بڑے خراب ہوتے ہیں۔ وہ چھوٹے جائیں تو اودھم مچائیں اور جیل جائیں تو وہاں جیلر کو پریشان کریں......۔''

''تو کیا بابا آپ نے بھی چکی پیسی اور بان بٹے ہیں؟''

''ہاں بی صفو! یہ دیکھو، اب تک میرے ہاتھوں میں گھٹے پڑے ہیں۔''

''اور کسی دن آپ نے کم پیسا ہوگا تو مار بھی پڑی ہوگی۔''

''ہاں بیٹی رشّو! ایک دن میرا جی اچھا نہ تھا۔ پورا آٹا پیس نہ سکا تو ہنٹر سے میری خبر لی۔ کھال ادھیڑ کر رکھ دی میری۔''

''بڑا خراب تھا جیلر، ہمارے بابا کو مارا اُس نے۔''

''نہیں میاں کوکو۔'' اس وقت میں تمہارا بابا کب تھا۔ اس وقت تو میں چور تھا، ڈاکو تھا، بدمعاش تھا۔ اس سے زیادہ میری درگت بنتی تو کم تھا۔ تم لوگ دعا کرو کہ اللہ مجھے معاف کر دے۔ اگر اللہ نے معاف نہ کیا تو یہاں جیل کاٹی، وہاں جہنم میں بھی بھُننا پڑے گا۔''

''بابا نے یہ جہنم والی بات اس طرح کہی کہ ہم سب نے کانوں پر ہاتھ رکھے اور توبہ توبہ کرنے لگے۔ بابا اپنی کہہ رہے تھے۔''



بجلی کا کھمبا

جب سے ہمارے گاؤں میں بجلی آئی ہے۔ ہمارے گاؤں کی راتیں دن کی طرح اُجیالی رہتی ہیں۔ ہمارے گاؤں میں بجلی کا ایک کھمبا پرانی املی کے پاس لگا ہے۔ یہ پرانی املی بڑی گھنیری ہے۔ پہلے اس کے نیچے بڑا اندھیرا رہتا تھا۔ بجلی کا کھمبا لگ جانے سے اب اس کے نیچے خوب اُجالا رہتا ہے۔ املی کا سایہ جاڑوں کی راتوں میں گرم پڑتا ہے۔ گاؤں میں بجلی آئی تو اس املی کے نیچے الاؤ لگا۔ آگے چل کر یہی الاؤ گاؤں کا سب سے بڑا الاؤ ہو گیا۔ جاڑے آئے اور الاؤ لگا۔ اور پھر گاؤں کے لوگ گھنٹہ آدھ گھنٹہ رات ہوتے ہی اکٹھا ہونے لگے۔ سب آ آ کر الاؤ کے آس پاس بیٹھتے ہیں اور پھر وہ ساری باتیں ہوتی ہیں، جو جس کے جی میں ہوتی ہیں۔ کھیتی باڑی کی باتوں سے لے کر الیکشن تک کی باتیں ہوتی ہیں۔ کہیں زلزلہ آیا، یا فساد ہو گیا یا توڑ پھوڑ کی خبریں اخباروں میں آئیں تو ان کے بارے میں بھی لوگ اپنا اپنا خیال ظاہر کرتے ہیں۔ پھر آپ بیتی، گھر بیتی اور جگ بیتی کی کوئی ایسی بات چھڑتی ہے، جس میں کہانی کا لطف آ جاتا ہے۔ اس طرح آپ بیتیاں اور جگ

بیتیاں جب کلّو کا کا کہتے تو لوگ بڑے دھیان سے سنتے ہیں۔

کلّو کا کا گاؤں بھر کے کا کا ہیں۔ کیا ہندو کیا مسلمان، کیا بچے کیا جوان۔ وہ سبھی کے کا کا ہیں۔ گاؤں کے بڑے بوڑھے بھی انھیں کا کا کہتے ہیں۔ اور ان بڑوں کی اولادیں بھی۔ سب ان کی عزت دل سے کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کلّو کا کا آپ بیتی یا جگ بیتی سنانے لگتے ہیں تو سب چپ سادھ لیتے ہیں اور ان کی باتوں کی طرف کان لگا دیتے ہیں۔ اور بھائی سچی بات یہ ہے کہ کلّو کا کا جو کچھ کہتے ہیں وہ بڑے کام کا بھی ہوتا ہے۔ نصیحت بھی ملتی ہے اور کہانی سننے کا مزہ بھی آتا ہے۔

ذرا سنئے تو ایک دن کی بات۔ ہوا یہ کہ الاؤ کے پاس بیٹھے بیٹھے اور باتیں کرتے کرتے کسی نے چھیدا کی لڑکی چندو کی سگائی کے بارے میں بتایا کہ اس کی ''سگائی'' اس بار بھی نہ ہوسکی۔

''کیوں؟'' کئی آدمیوں کی زبان سے نکلا اور سب بتانے والے کی طرف دیکھنے لگے۔

''کیا بتاؤں، کیوں نہ ہوسکی۔'' بتانے والے نے کہنا شروع کیا۔ ''آپ تو جانتے ہی ہیں کہ چندو کی سگائی پہلے اکبر پور میں ہونے والی تھی۔ اکبر پور والے چھیدا کی حیثیت سے زیادہ مانگ رہے تھے۔ پھر جب بڑی مشکل سے غریب نے کنور پور میں '' بَر'' ڈھونڈھ نکالا تو ان کی مانگ بھی اتنی ہے کہ چھیدا بھائی گھر بیچ کر بھی نہ دے سکیں گے۔ تو بھائی! اب بتاؤ سگائی ہو تو کیسے؟''

یہ سن کر سارے لوگ اس طرح چپ ہو گئے جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا ہو۔
کچھ دیر بعد کریم بابا نے افسوس کرتے ہوئے کہا کہ ''ہندوؤں کے یہاں بیاہ میں سودا بازی اور مسلمانوں میں جہیز کی لعنت اس بُری طرح سے گھس آئی ہے جس نے ہمارے سماج کو بُری طرح کھوکھلا کر دیا ہے۔ اس کا رونا روتے تو سب ہیں لیکن کسی سے یہ نہیں ہوتا کہ اس کے خلاف آواز اٹھائے اور کسی طرح یہ بندھن ٹوٹیں۔''
کریم بابا یہ کہہ کر چپ ہوئے تو پھر وہی سناٹا چھا گیا۔ کلّو کاکا نہ جانے کس سوچ میں تھے۔ کچھ دیر بعد ایک لمبی ''ہوں'' کر کے سر اٹھایا اور بولے:
''اب ہمارے گاؤں کا حال یہ ہو گیا ہے کہ چندو جیسی لڑکی کنواری بیٹھی ہے اور ہم کھلی آنکھوں دیکھ رہے ہیں۔''
کلّو کاکا بھی یہ کہہ کر چپ ہو گئے تو پھر وہی سنّاٹے کا سنّاٹا۔ آخر ایک منچلے جوان نے ہمت کر کے کلّو کاکا سے کہا:
''کلّو کاکا! یہ اب اور تب والی بات کیسی کہی آپ نے؟''
''پھندن بھیا! سنو گے اب اور تب والی بات؟'' کلّو کاکا نے پھُندن بھیا کو دیکھا۔
''کیوں نہیں، ضرور سنیں گے!'' اور آدمیوں نے پھُندن کی ہاں میں ہاں ملائی۔
''اچھا تو سنو، اب سے پہلے جب ایسے موقعے آ جاتے تھے تو ہمارے اور تمہارے اسی گاؤں والے کیا کرتے تھے؟ میں یہی بات بتاؤں گا اور بات بھی اس

وقت کی ہے جب میں ادھیڑ عمر میں تھا اور کریم بابا اس وقت جوان تھے۔ انھیں بھی یاد ہو گی وہ بات۔''

کریم بابا اپنا نام سن کر چونکے اور کلّو کاکا کی طرف کان لگا دیئے۔ کلّو کاکا کہہ رہے تھے۔ 'رسول بھائی بڑے ہی اچھے آدمی تھے۔ خدا ان کی قبر کو ٹھنڈا رکھے۔ ان کی لڑکی جوان ہو چکی تھی۔ رسول بھائی نے اس کے بیاہ کے لئے برسوں سے جوڑ جوڑ کر قریب قریب پانچ ہزار کا جہیز تیار کر لیا تھا۔ شادی کے دن کے لئے بھی دو ہزار روپیہ جیسے تیسے جمع کر رکھے تھے۔ ایک دن مجھے ساری تیاری کا حال بتا رہے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ کٹنئی کا کام ختم ہوتے ہی اس نیک کام سے فراغت حاصل کر لیں گے۔ لیکن ابھی فصل کاٹی ہی جا رہی تھی کہ گاؤں میں ایک حادثہ ہو گیا۔

''حادثہ؟'' کئی آدمیوں نے دہرایا اور سب کلّو کاکا کا منہ دیکھنے لگے۔

''ہاں حادثہ! ہمارے گاؤں میں کبھی ایسا نہیں ہوا۔ ان دنوں جُدّھی سنگھ کی جوانی کی دھوم تھی۔ وہ ڈنڈ پیلتا، کشتی لڑتا اور مخملی کنارے کی دھوتی باندھے اور لٹھ لئے چاروں طرف دندناتا پھرتا۔ اس نے اپنے اکھاڑے کے کچھ پٹھّوں کو اپنا دوست بنا لیا تھا۔ اس طرح اس کا ایک جتھا بن گیا۔ اس جتھے نے اسے بڑا گھمنڈی بنا دیا تھا۔ اس کے اس گھمنڈ کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ دوسرے کھیتوں کا پانی اپنے کھیتوں میں کاٹ دیتا اور جب شکایت کرنے والا شکایت کرتا تو اُلٹی پلٹی سناتا۔ اکثر لوگ اس خیال سے چپ ہو جاتے کہ جھگڑا نہ بڑھے۔ مگر بھائی سب کا مزاج

ایک طرح کا تو ہوتا نہیں۔ ایک دن جنگو نے پانی کاٹتے دیکھ لیا اور چھٹتے ہی گالی اس کے منہ سے نکل گئی۔ جُدّھی سنگھ بھلا جنگو کی گالی کیسے سہتا۔ وہ لاٹھی کی طرف بڑھا۔ آس پاس کے لوگوں نے جھگڑا بڑھتے دیکھا تو معاملہ رفع دفع کر دیا۔

جُدّھی سنگھ اس وقت تو چپکا چلا گیا۔ لیکن انہیں دنوں میں تال گاؤں کے اندر نیا نیا تھانہ بنا تھا۔ جدّھی سنگھ کچھ سوچ کر تھانے جانے لگا۔ تھانیدار سے میل جول بڑھانے لگا۔ نہ جانے کیا جوڑ توڑ کیا کہ تھانیدار نے جنگو کو ایک مقدمہ میں دھر لیا۔ پھر جب کچہری کی نوبت آئی تو گاؤں والوں نے اس کی طرف سے دل کھول کر صفائی دی۔ لیکن اندر نہ جانے کیا معاملہ تھا کہ غریب جنگو پر چار ہزار کا جرمانہ ہو گیا اور جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں سال بھر کی سزا۔ اس پر ہم سب کو بڑا افسوس ہوا۔ لیکن کر بھی کیا سکتے تھے۔"

یہاں تک حال کہہ کر کلّو کاکا ذرا رکے۔ اُن کے چپ ہوتے ہی کئی آدمیوں نے ایک ساتھ پوچھا۔ "تو کلّو کاکا! کیا جنگو جیل بھیج دیا گیا؟"

"ہاں وہ وہیں عدالت سے جیل بھیج دیا گیا۔ لیکن تیسرے دن چھوٹ کر گاؤں میں آ گیا۔"

"یہ کیسے؟" سب نے تعجب کرتے ہوئے کہا۔

"یہ ایسے کہ جنگو کی شادی کو ہوئے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے۔ جنگو رسول بھائی کا پڑوسی تھا۔ جنگو کی نئی نویلی دلہن بڑی حیادار اور شرمیلی تھی۔ اُس نے اپنی پڑوسن سے رو رو کر اپنا دکھڑا سنایا اور کہا کہ میں گھر میں اکیلی ہوں۔ جدھی سنگھ ہمارا

دشمن ہو گیا ہے۔ رسول چاچا سے کہہ کر مجھے اپنے گھر میں پناہ دیدو۔ میرے میکے میں بھی کوئی ایسا نہیں، جہاں چلی جاؤں۔"

رسول بھائی کی بیوی نے ساری کتھا اُنھیں سنائی۔ رسول بھائی بڑے نمازی اور اللہ والے آدمی تھے۔ وہ سن کر کسی گہری سوچ میں پڑ گئے۔ بیوی نے کہا۔ "اس بے چاری کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔ آخر ہماری بھی تو لڑکی ہے۔ اونچ نیچ سبھی کے آگے پیچھے لگی رہتی ہے۔ خدا جانے کب کیا ہو۔ کیا حرج ہے۔ آج ہم اس غریب کے کام آئیں گے تو کل خدا ہماری مدد کرے گا۔"

"ہاں انوری کی ماں! کچھ اسی طرح میں بھی سوچ رہا ہوں۔ میں نے ایک مولوی صاحب کے وعظ میں سنا ہے کہ جو زمین والوں پر رحم کرتا ہے۔ آسمان والا اس پر رحم کرتا ہے۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ کسی ترکیب سے جنگو کو چھڑا لایا جائے۔"

"کیسے؟" بیوی نے پوچھا تو رسول بھائی نے کہا۔ "یہ تمہاری ہمت اور حوصلے پر ہے۔ دیکھو تو انوری کی ماں! انوری کی شادی کو تو دو مہینے سے اوپر ہیں اور جنگو پر آج وقت پڑا ہے۔ ہم کیوں نہ انوری کا جہیز اونے پونے بیچ دیں اور جرمانہ ادا کر کے جنگو کو چھڑا لائیں۔"

رسول بھائی کی یہ تجویز سن کر بیوی سناٹے میں آ گئی۔ مگر بھائی بیوی ہو تو ایسی ہو۔ اس نے بھی کمال کر دیا۔ جانتے ہو کیا کہا اس نے؟" کلّو کا کا نے کہتے کہتے ہم سب سے سوال کر دیا۔ پھر خود ہی بتانے لگے۔ اُس نے کہا۔ "بیچ دو جہیز اللہ مالک

ہے۔جنگو کو اپنی نئی نویلی دلہن کے پاس رہنا چاہئے۔جیل میں نہیں۔“

کلّو کا کا یہ کہہ کر رکے اور سامنے رکھے ہوئے حقّے کے دم لینے لگے۔اور ہماری یہ حالت کہ آگے کا حال سننے کے لئے بے چین ہونے لگے۔آخر ہم سے نہ رہا گیا اور کئی آدمیوں کے منہ سے ایک ساتھ نکلا:

”تو کلّو کا کا!رسول بھائی نے جہیز بیچ دیا؟“

”ہاں بھائی!بیچ دیا اور دوسرے ہی دن جا کر روپیہ سرکار میں جمع کر دیا اور پھر رات کو نو بجے گھر آئے تو جنگو ان کے ساتھ تھا۔یہاں جہیز خریدنے والے کے سوا کسی کو پتہ بھی نہ تھا۔گاؤں کے لوگ چندہ کرنے کی سوچ رہے تھے اور وہاں سارا ثواب رسول بھائی ہی چپکے سے لوٹ چکے تھے۔“

”واہ واہ!جے ہو رسول بھائی کی۔خدا ان کی قبر کو ٹھنڈا کرے۔ہندو مسلمان، بوڑھے، جوان ہم سب نے رسول بھائی کے بارے میں اچھے اچھے بول اپنے منہ سے نکالے۔کلّو کا کا نے یہ قصہ سنا کر ہم سب سے کہا۔”تو آج چھیدا کی لڑکی چندو اب ہمارے گاؤں میں یوں ہی بیٹھی رہے گی۔ہرگز نہیں، وہ ہم سب کی لڑکی ہے اور ہم سب رسول بھائی ہی کے تو بھائی بند اور نام لیوا ہیں۔“

کلّو کا کا کے کہنے پر ہم سب نے چندو کے لئے کیا کیا؟یہ تو بعد کی بات ہے۔لیکن کلّو کا کا کی زبانی گاؤں کی یہ کہانی سن کر ایک بات سب کے من میں کلبلانے لگی۔آخر ہم نے کلّو کا کا سے پوچھ ہی لیا:

''کلّو کا کا! پھر رسول بھائی پر آسمان والے نے کیسے رحم فرمایا؟'' ہمارے اس سوال کا جواب کلّو کا کا نے کچھ نہیں دیا۔ ہم نے پوچھا۔ بار بار پوچھا گیا تو وہ اٹھ کر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد کریم بابا نے بتایا کہ دراصل انوری کا جہیز کلّو کا کا ہی نے رسول بھائی سے خریدا تھا۔ پھر جب دو مہینے کے بعد انوری کی شادی ہوئی تو یہی سارے کا سارا جہیز رسول بھائی کے گھر سے نکلا۔

''ارے وہ کیسے کریم بابا، کیا پھر رسول بھائی نے ان سے خرید لیا؟''

''نہیں، رسول بھائی کے پاس اب پیسہ کہاں تھا۔ کلّو کا کا نے رقم لئے بغیر سارا جہیز ویسا کا ویسا ہی واپس کر دیا۔ رسول بھائی نہیں لے رہے تھے۔ لیکن کلّو کا کا نے یہ کہہ کر چپ کر دیا کہ ''انوری ہماری بیٹی ہے، ہماری طرف سے یہ جہیز اُسے دے دینا۔''

اس کے بعد کریم بابا نے یہ بتایا کہ ہمارے اس بھائی چارے کا اثر جدھی سنگھ پر یہ پڑا کہ اس نے بھی جنگو سے میل کر لیا اور اس نے بھی وہ سب حرکتیں چھوڑ دیں جو اُس نے اپنا رکھی تھیں۔

''کریم بابا سے یہ سنا تو ہمیں ایسا محسوس ہوا جیسے ہمارا ماتھا اونچا ہو گیا ہو۔ ہم اپنے پرانے گاؤں پر فخر کرتے ہوئے وہاں سے اٹھے اور اپنے اپنے گھروں کی طرف چل دیئے۔ بجلی کا کھمبا اپنی جگہ کھڑا تھا۔ اس کی روشنی دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ لیکن ہمیں ایسا لگا جیسے آج ہمارے دل و دماغ بھی ایمان کی روشنی سے منور ہو گئے ہوں۔''

☆☆☆